Psychological Dimension of Ghalib's Poetic Style

غالب کے شعری اسلوب کی نفسیاتی جہت

Dr. Qandil Badar *
Wasaf Basit♣

ABSTRACT:

The interpretation of Ghalib's poetry has been approached from multiple perspectives, revealing many facets of his art, thought, and style. However, the complete key to understanding the magic of his poetry remains elusive. Ghalib's style is not rooted in tradition, as his rationality, boldness of expression, and innovative language are unique products of his modernist mindset. His individuality, a primary reason for his rejection in his time, became a defining strength.

Ghalib's philosophical mind and ego drove him to create a distinct path, leading to a complex and obscure style. Interrogation and skepticism are central to his thought, as he questioned historical, cultural, and religious truths, often rejecting them. To conceal his iconoclastic ideas, he deliberately employed ambiguity, making his style intricate and challenging to interpret. This study focuses on this defining feature of Ghalib's poetic style, particularly his conscious use of obscurity and ambiguity.

Key Words: *Ghalib, stylistics, psychological dimensions, and poetry*

کلام غالب کی شرح سے لے کر تعبیر و تفہیم تک کے کئی مدارج طے کیے جا چکے ہیں۔لگ بھگ دو ہزار اشعار پر مشتمل مختصر سے اردو دیوان نے ابھی تک متشرحین وناقدین کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔درجنوں شرحیں اوران گنت مقالات و کتب غالب شناسی کے ضمن میں قلم بند کی جا چکی ہیں۔کئی زاویوں سے کلام غالب کے مطالعات پیش کیے جا چکے ہیں اور ان کے فن و فکر کے بے شمار پہلو دریافت ہو چکے ہیں۔بازیافت کا یہ سلسلہ تاحال پوری سنجیدگی سے جاری وساری ہے لیکن کلام غالب کے طلسم کی کلید فی الوقت ہاتھ نہیں آسکی۔تاہم اتنی بات طے ہے کہ غالب کی شاعری میں کوئی ایسی خوبی ضرور موجود ہے جو ان کو پہلی نظر میں اردو کی تمام شاعری سے ممیز کرتی ہے۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے[1]

* Chairman, Department of Urdu, SBK Wiman University Quetta.
♣ Lecturar, Department of Psychology, Govt College Quetta.

غالب کی یہ ''ادائے خاص''آخر اتنی جداگانہ حیثیت کی حامل کیوں کر ہوگئی۔اس کی بنیادی وجہ ان کی لغت و فرہنگ ہے یا پھر ان کا تجدید پسند ذہن ؟اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ غالب کی شخصیت اور ذہن جس میں یقیناًان کے توارث،ان کے حالات زندگی اور ان کے مطالعے تک کے سبھی عوامل شامل کار رہے ہیں،ان کی اسلوب سازی کے اہم محرکات ہیں۔البتہ ان محرکات کے علاوہ بھی ان کی ذہنی استعداد بہت منفرد،جداگانہ اور خداداد تھی۔

غالب کے اسلوب کی گرہ کشائی سے قبل مختصراًیہ دیکھتے ہیں کی اسلوب کیا ہے؟نیز شاعری کے اسلوبیاتی تجزیے سے کیا مراد ہے؟اسلوب بنیادی طور پر طرز ادا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال کی تجسیم بھی ہے۔دوسرے لفظوں میں اسلوب کو نہ خیال سے جدا کیا جا سکتا ہے نہ طرز ادا سے۔یہ دونوں ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔خیال کے اظہار کا میڈیم الفاظ ہیں اور الفاظ در حقیقت مجرد خیالات کی تصاویر یا علامات ہیں۔معنی ان علامات یا تصاویر میں موجود نہیں ہوتے بل کہ ان اشیاو مظاہر،کیفیات و محسوسات،حقائق و واقعات میں موجود ہوتے ہیں،جن کے لیے یہ علائم و تصاویر گھڑی جاتی ہیں۔یہ تمام حقائق،بیان کرنے یا ہو جانے کی ممکنہ حد سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔اس لیے شاعرانہ اور ادبی بیانیوں میں بالخصوص ایسے کئی متبادل وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں جو معنی و مفہوم کو کسی حد تک ادا کر سکیں۔تاکہ ان ہی جذبات اور احساسات کے ابلاغ کو ممکن بنایا جا سکے جو شاعر کے دل پر گزرے ہیں۔اس لیے روزمرہ زبان کی بہ جائے مجازی زبان کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے۔یعنی استعارات،تشبیہات، تلمیحات،کنایات اور ایسی کئی دیگر اصطلاحات کو برت کر اپنے خیال کی ترسیل کو ممکنہ بنایا جاتا ہے۔اسلوب کی اس مختصر سی تعریف کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی شعری سیاق کے اسلوبیاتی تجزیے سے مراد شاعر کے ذہن و نفسیات اور اس کے عہد کی روشنی میں اس کی شعری زبان اور اس کے برتاوے سے معنی کی تسخیر تک کے تمام مراحل کی جان کاری ہے۔

غالب کے دور تک آتے آتے اردو شاعری اپنی تاثیر مکمل طور پر کھو چکی تھی۔پوری فضا پر مردنی چھائی تھی،تازگی کا شائبہ تک باقی نہ رہا تھا۔ایسے میں غالب نے اپنی بھرپور تخلیقی قوت سے اردو شاعری کے مردہ بطن میں ایک نئی روح پھونکی۔اپنی پر جوش متخیلہ اور تجربہ پسند طبیعت سے ایک تازہ اسلوب کی تعمیر کی۔پہلی سطح پر فارسی اور اردو کے گھسے پٹے روایتی مضامین میں ایک نئی جان ڈالی اور دوسری سطح پر خالصتاً ذاتی نوعیت کے مضامین اور تجربات کیے جن کی کوئی ادنی مثال بھی روایت سے پیش کرنا ممکن نہیں۔یوں

اردو شاعری کی موجودہ فضا کو یک سر تبدیل کر دیا۔ غالب کی زندگی میں اس کے کلام کو مہمل و بے معنی قرار دے کر بالائے طاق رکھ دیا گیا لیکن جوں ہی زمانے کا مذاق بدلا، اس جنس فاسد کو آنکھوں سے لگا لیا گیا۔ عہد غالب تک اردو غزل کی ایک ہی روش چلی آرہی تھی، وہی بندھے ٹکے مضامین اور ان کو لکھنے کا وہی طرز عام۔ غالب ہر اعتبار سے روایت شکن اور جدید ذہن کے پروردہ تھے۔ چناں تمام سابقہ معیارات کو ملیامیٹ کر کے اردو شاعری کے نئے معیار کو تشکیل دیا اور تا حال اس معیار کا واحد نمونہ ان کا اپنا کلام ہے۔ چناں چہ یہ شعری دعوے بے جا نہیں

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور[2]

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں[3]

آتش کدہ ہے سینہ مرا، راز نہاں سے
اے وائے! اگر معرض اظہار میں آوے[4]

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں[5]

غالب کا اسلوب طے کرنے میں ان کے مزاج کے ساتھ ان کی ابتدائی فارسی تعلیم کا مقتدر کردار رہا ہے۔ اس کے ساتھ اوائل عمری میں بیدل سے متاثر ہونا بھی اچھنبے کی بات ہے۔ ابتدائی طور پر غالب کے اسلوب کی تشکیل کا سب سے اہم محرک بیدل ہی ہیں۔ لیکن اردو زبان بیدل کے رنگ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی اس کا اندازہ کچھ تو خود غالب کی تنقیدی بصیرت کو ہو چکا تھا کچھ ان کے قابل دوستوں نے دلایا۔ یوں غالب جلد ہی اپنی راہ نکالنے میں کام یاب ہو گئے۔ ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں:

"بیدل کے تتبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزا نے اپنے بیان کی ندرت اور تخیل کی جدت کے لیے اپنا علیحدہ طرز ایجاد کیا جو انہیں کے لیے مخصوص رہا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا۔ مرزا نے آخری زمانے میں اس طرز کے غریب اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن

مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا‘‘[6]۔

غالب کا اسلوب کسی روایت کی تقلید پر مبنی نہیں۔ان کے ہر شعر سے ان کی اپنی شخصیت جھلکتی ہے۔ان کے اسلوب پر ان کے متقدمین و معاصرین کسی کی طرز کی ہلکی یا گہری چھاپ کا شائبہ تک نہیں۔ اس طرز کے مطالعات انصاف پر مبنی نہیں کیوں کہ غالب کی عقلیت، اس کی جرأت اظہار اور اس کے لیے اختراع کی گئی زبان، صرف اور صرف غالب سے مخصوص ہے اور ان کی تجدد پسندی کی دین ہے۔اپنے عہد میں ان کی نا قبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہی ان کی انفرادیت تھی۔وہ حیرت انگیز حد تک مختلف تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کو بھی حیران کرنے میں پوری طرح کام یاب ہو گئے تھے لیکن اس قدر نئی اور توانا آواز سننے کا وہ دور متحمل نہیں ہو سکتا تھا چناں چہ دھتکارنے کا شیوہ اپنالیا کیوں کہ اسی میں اپنی عافیت سمجھی۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر[7]

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا[8]

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش ہوا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں[9]

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے! عجب آزاد مرد تھا[10]

اپنے عہد کے اس سلوک نے غالب کو اپنی راہ الگ نکالنے کی بھر پور قوت عطا کی۔وہ مختلف و منفرد تھے لیکن باد مخالف نے انہیں اور یکتا کر دیا۔چناں چہ شعوری طور پر انہوں نے متعدد اسلوبیاتی امتیازات قائم کیے جس کے باعث ان کے لہجے نے ایسی شدید انفرادیت اختیار کر لی ہے کہ شعر کی اولین قرأت یا سماعت، اس امر کی تصدیق کر دیتی ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے۔غالب کے شعر کو اس قدر منفرد اسلوب عطا کرنے کا پہلا محرک ان کی شخصیت ہے اور اس بات سے سب غالب شناس متفق ہیں کہ ان کی

شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو انانیت ہے۔ان کی انا انہیں روش عام پر چلنے نہیں دیتی، کسی کی رہبری قبول نہیں کرتی، کسی کے آگے سر نہیں جھکاتی، کسی کی منت کشی کو آمادہ نہیں ہوتی۔ خلیل صدیقی کے بہ قول:

''غالب کے مزاج میں عالی نسبی کے احساس، ابتدائی عیش کوش ماحول اور طبیعت کی اپج سے ایک خاص قسم کی وضع داری پیدا ہو گئی تھی، جس میں خودداری بل کہ انانیت کی ہلکی سی جھلک بھی تھی۔ان کی نفسیات اور موضوع و اسلوب کی وحدت، ان کے شعور ہی کا کرشمہ ہے کہ ان کے الفاظ میں، ترکیبوں اور بندشوں میں، لفظی ترتیب اور پیرایہ ادا میں، ایک خاص رکھ رکھاؤ اور سلیقہ، مخصوص حسن و تجمل کی ایک نئی طرح داری و وضع داری ملتی ہے۔ان کے ابتدائی کلام میں بیدل کی تقلید، فارسیت، طبیعت کی اپج کی کارفرمائی بھی بہت حد تک احساس تفوق کی شدت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔اسی لیے الفاظ کی بلند آہنگی اور طمطراق ہے، رعایتیں ہیں، اخلاق و غرابت ہے لفظوں کے حسن و تجمل کا تو نہیں، ایک پر تکلف ٹھاٹھ کا احساس ہوتا ہے۔[11]

غالب ایک آزاد شخصیت کے حامل تھے۔ روایت کی قید ہو، کائنات کی قید ہو یا مذہب و اقدار کی، وہ کسی بھی قید کو قبولنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ صرف اور صرف اپنی ذات پر انحصار کرتے ہیں اپنے بل بوتے حاصل کی گئی ناکامی ان کو کسی اور کے سہارے پائی گئی کام یابی سے لاکھ عزیز ہے۔ محتاجی تو خدا کی بھی گوارا نہیں۔ خود بینی و خود پسندی نے ہر حد پھلانگ دی۔ اپنی ذات اور اس سے جڑے غموں، تکلیفوں سے اس قدر انسیت ہے کہ آزار اور عذاب ہی میں لذت ملتی ہے۔ اس لذت کوشی نے انہیں اس قدر ہمت و حوصلہ عطا کیا ہے کہ ان کی آواز نے للکار کی شکل اختیار کر لی ہے۔

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوسی کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں[12]

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر[13]

دیوار، بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھایئے[14]

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی[15]

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں[16]

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر[17]

دوسروں سے الگ راہ نکالنے کے چکر میں غالب نے اشکال پسندی اختیار کر لی اور عدیم الفہم ہوتے چلے گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا غالب جیسا باشعور انسان بے خبر تھا کہ اس کا کلام عام فہم نہیں ہے لہذا رد کیا جا رہا ہے۔ تو اس کا جواب ان کے بہت سے اشعار میں واضح صورت میں موجود ہے۔ ان کا اسلوب ان کا من چاہا تھا۔ لیکن الگ راہ نکالنے کے ساتھ ساتھ غالب کو کچھ اور خدشات بھی لاحق تھے۔ ان کے شعری اسلوب کے تشکیلی عناصر میں ان کے فلسفیانہ ذہن کی بھی خاص کارفرمائی موجود رہی ہے۔ استفہام اور تشکیک ان کی فکر کے دو اہم ستون ہیں۔ اس لیے اسلوب سازی میں بھی ان کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ ان کا سوالیہ ذہن خدا کی ذات سے لے کر کائنات اور کائنات سے لے کر اپنی ذات کو محیط ہے۔ وہ ہر بتائی جانے والی اور دہرائی جانے والی حقیقت کو من و عن قبول نہیں کرتے۔ بل کہ ایسے تمام حقائق ان کی فکر کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ یوں وہ ہر تاریخی، تہذیبی اور مذہبی حقیقت کو فکر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں کچھ کو رد کرنے کا جرأت مندانہ اقدام سرانجام دیتے ہیں اور کچھ کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ یہ اپنے عہد کے مقابل غالب کا انتہائی جارحانہ رویہ تھا جس کی انھیں سزا بھی ملی۔ اپنے روایت و مذہب شکن خیالات کو چھپانے کے لیے بھی غالب نے اپنے اسلوب کو مشکل، پیچیدہ اور عسیر الفہم بنانے کی شعوری اور دانش مندانہ کوشش کی۔

شعری زبان اسلوبیاتی مطالعے کی پہلی جہت ہے۔ غالب کی فکر کا اپنا ایک جداگانہ اور منفرد علاقہ تھا۔ وہ اپنی فکر کے جہان تازہ سے بہ خوبی واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اردو جیسی کوئی کم سن زبان ان کے افکار کو مقید کرنے کے لیے کافی نہیں۔ وہ فارسی زبان کے دل دادہ تھے کیوں کہ ان کو فارسی اپنی فکر کے تمام پہلو سمیٹنے پر قادر دکھائی دیتی تھی۔ اردو میں اپنے افکار کی منتقلی کے لیے ان کو ایک نئی زبان بنانے کا مرحلہ درپیش تھا چناں چہ انھوں نے فارسی کو بنیاد بنا کر ایک نئی زبان اختراع کی۔ یوں اردو کی مروجہ شکل کو یک سر بدل دیا۔ غالب کی شعری زبان فارسیت پر مبنی ہے، فارسیت آمیز ہے یا اس پر فارسیت کا غلبہ ہے۔ یہ

ہر حال غالب کے اسلوب کی تفہیم کی پہلی کڑی ان کی یہی اختراعی زبان ہے جو فارسی اور اردو کی ملاوٹ یا تحلیل سے بنائی گئی ہے۔غالب سے قبل بھی ولی دکنی بل کہ امیر خسرو کی شاعری ہی سے اردو اور فارسی کے تال میل کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن غالب کی فارسیت کا معاملہ اور تجربہ ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔غالب نے نہ صرف فارسی الفاظ و تراکیب، محاورے و مصادر کا استعمال ہی نہیں کیا بل کہ اردو ریختہ کو رشک فارسی بنانے کا شعوری اقدام بھی کیا ہے۔ان کے کل کلام میں فارسی مقدار کے اعتبار سے بہ ظاہر کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے لیکن پس پردہ ایک جیسی مقدار میں شامل کار رہتی ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب نفسیاتی سطح پر ہمیشہ فارسی سے مرعوب رہے یہ مرعوبیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔اگر یہ کہا جائے کہ وہ شعر فارسی ہی میں سوچتے تھے پھر شعوری کوشش سے دو چار لفظ بدل کر اسے اردو بنا دیا کرتے تھے تو غلط نہ ہو گا۔نیاز فتح پوری کے بہ موجب:

"ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

اس شعر کو بھی فارسی میں سوچا گیا اور ادا کیا گیا اردو میں نہایت تکلف کے بعد۔۔۔اسی لیے ادنی تغیر سے آپ اسے اصلی ماخذ کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔

از شکستن ہم دل نومید یارب تا کجا
آبگینہ کوہ را عرض گرانجانی کند"[18]

غالب کی مشکل پسندی اور عسیر الفہمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ان کے مختصر سے دیوان کا بھی ایک بہت بڑا حصہ تا حال نا قابل فہم ہے۔ان کے کلام کی عدم تفہیم کی بنیادی وجہ کیا غالب کی فارسیت آمیز زبان ہے ؟ لیکن لغت پاس رکھنے سے بھی یہ مشکل آسان نہیں ہوتی کیوں کہ دراصل مشکل، زبان سے زیادہ اس کو برتنے کی تکنیک میں پوشیدہ ہے۔غالب نے اپنی نازک خیالی اور انوکھی بصیرت کو اس قدر پیچیدہ زبان میں منتقل کیا ہے کہ ان کے بیش تر اشعار اپنی تفہیم کے سلسلے میں قاری کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ زبان افعال کے علاوہ زیادہ تر فارسی ہے۔فارسی کی تراکیب و مرکبات کا کثیر انبوہ ان کے شعری سرمایے میں منتقل ہوا ہے۔اس ضمن میں افتخار جالب رقم طراز ہیں:

''غالب نے فارسی غزل کے آب و رنگ کو اردو غزل میں منتقل کرنے کی شعوری کوشش کی اور اس کوشش میں یہ خیال رکھا کہ فارسی غزل اپنی صورت، سیرت اور شکل کو برقرار رکھتے ہوئے اردو غزل بن جائے۔اس جدوجہد میں فارسی غزل کا ماڈل بہت حد تک قائم رہا ہے۔غالب نے پہلے فارسی غزل کے ہیئت کو پہچانا، غزلیات کے تنوع سے ایک وحدت اخذ کی، ہیئت کی تجرید کی، پھر اس قالب میں اس ہیئت کے موافق اپنی غزل بنالی۔[19]

غالب کا مختصر اردو دیوان ذخیرۂ الفاظ اور سرمایے کے اعتبار سے بہ لحاظ تناسب و مقدار کسی اردو شاعر سے کم نہیں۔ لغت کے تنوع کے ساتھ ان کی اختراعات بھی قابل داد ہیں کیوں کہ زبان کے سلسلے میں یہ اجتہادی رویہ بہت کم شعرا کا حصہ ہے۔شان الحق حقی کی تحقیق کے مطابق ان کے اردو کلام میں مکررات کو چھوڑ کر چھ ہزار سے زائد الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جن کا تقریباً ۸۰ فی صد حصہ فارسی ہے۔غالب کے ہاں ایسے اشعار کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جس میں صرف ایک آدھ لفظ اردو کا استعمال ہوا ہے اور وہ الفاظ زیادہ تر افعال ہیں جن کی بہ دولت فارسی اشعار نے اردو کا قالب اختیار کر لیا۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریے سے یاں، پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا[20]

لغت کے اعتبار سے کلام غالب کا امتیازی عنصر وہ لفظی اختراعات اور پر تخیل و تکلف تراکیب ہیں جو انہی سے مخصوص ہیں۔ اگر ان کی فہرست مرتب کی جائے تو ان کے دیوان کا کثیر حصہ نقل کرنا پڑے گا۔ تراکیب کے علاوہ انہوں نے کمال فن کاری سے فارسی کے بہت سے محاورات کو بلا تکلف اردو میں منتقل کر دیا۔ چناں چہ 'سر کشیدن' کو سر کھینچنا اور 'ذوق بہم آوردن' کو 'ذوق جمع کر' میں بدل دیا جو کسی صورت کانوں کو بھلے معلوم نہیں ہوتے۔اس کے ساتھ ساتھ فارسی مصادر کی کثیر تعداد بہ شکل افروختن، آرمیدن، باختن، چکیدن، نشستن، گسترن، لرزیدن، مردن وغیرہم، ان کے دیوان اردو میں جا بہ جا اپنی اصل شکل میں درج ہوئے ہیں۔۔ بہت سے فارسی الفاظ، اپنے اصل فارسی مفاہیم کے ساتھ، بہت سے فارسی الفاظ جو فارسی میں دو طرح سے لکھے جاتے ہیں اور اردو میں ان کی صرف ایک ہی شکل معروف ہے،

ان کی غیر معروف شکل فارسی املا کے مطابق برتی گئی ہے۔ مثلاً آزاد کی بہ جائے آزادہ، جوش کی بہ جائے جوشش ۔ نیز تذکیر و تانیث اور واحد جمع بھی فارسی قواعد کے مطابق آئے ہیں۔ یہ ان کی فارسیت سے مرعوبیت کی محض چند ادنی مثالیں ہیں۔ پروفیسر احمد علی تحریر کرتے ہیں:

''فارسی ایک محذوفاتی زبان ہے لیکن غالب کے یہاں محذوفات کا استعمال عام یا معمولی قسم کا نہیں ہے بل کہ فارسی کا سا بھی نہیں ہے۔ یہ اسلوب کی ایک خصوصیت ہے، اس کے انداز بیان کا ایک کرتب ہے جس سے وہ الفاظ اور تصورات کو ایک دوسرے سے جوڑ کر خلط ملط کر دیتا ہے۔۔۔ غالب کے پر پیچ اظہار بیان کے لیے الفاظ کی غیر معمولی ترتیب کی ضرورت کس طرح پڑتی ہے۔ جملوں کی ساخت میں پیچ و خم پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی قواعد مسخ ہو جاتی ہے۔ الفاظ کو معانی کے مطابق بنانے کے لیے انھیں ان کی معمول کی جگہوں سے ادھر ادھر ہٹا دیا جاتا ہے اور افعال کا استعمال ایک سے زیادہ فقروں کے لیے ہونے لگتا ہے جس سے قواعد کی اور زیادہ پیچیدگی اور مزید ابہام پیدا ہو جاتا ہے[21].

غالب کا شعر اسلوبیاتی سطح پر اتنا تازہ اور انوکھا کیوں کر دکھائی دیتا ہے جب کہ غزل کے ظرف تنگ نائے میں تبدیلی کی گنجائش ہی بہت کم نکلتی ہے۔ اور سطحی نظر میں غالب کی بحور ان کے ردائف و قوافی ان کے علائم اور استعاروں کی خاصی تعداد روایتی ہی ہے۔ دانیال طریر کے تجزیے کے باوصف غالب نے غزلیہ شاعری کی ہیئت کو تبدیل نہیں کی بل کہ اپنی خلاقیت کا اظہار آہنگ کی سطح پر کیا۔ ان کا آہنگ روایتی غزل سے قطعی مختلف ہے۔ ایک منفرد آہنگ کا تجربہ وہ بھی غزل ایک دشوار گزار عمل ہے۔ اس تجربہ کی تین سطحیں ہیں۔

ا۔ غالب نے بحور کی روانی اور بہاؤ کو اپنے خیال و احساس کی روانی کا پابند بنا کر آہنگ کی سطح پر وہی ذائقہ پیدا کر دیا جو دور حاضر کی نظم کا ذائقہ ہے۔

۲۔ اپنے شعری آہنگ کو مختلف بنانے کے لیے غالب نے شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان خلا رکھنے کا حیرت انگیز تجربہ کیا۔ ان کے اشعار کی خاصی کثیر تعداد ایسی ہے جن میں شعر کا پہلا مصرع دوسرے مصرعے سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''میں غالب کے اشعار میں پائے جانے والے خلا کو صرف معنوی خلا نہیں سمجھتا بل کہ مجھے یہ

خلا معنوی، لفظی، لفظوں کے مابین ربط، الفاظ اور معنی کے مابین ربط، مصرعوں کے مابین ربط، خیال اور مثال کے مابین ربط، شعر کے صوتی اور صوری ارتباط، نفسیاتی کیفیت اور اظہاراتی ارتباط نیز موضوعاتی اور جمالیاتی ارتباط، ہر جگہ موجود دکھائی دیتا ہے[22]۔

۳۔آہنگ کے حوالے سے ان کا تیسرا تجربہ رموز واو قاف کا استعمال ہے۔ان کے اشعار کی بامعنی قرأت رموز واو قاف لگائے بغیر ممکن نہیں تاہم رموز واو قاف کا ایک ہی شعر میں مختلف مقامات پر مختلف استعمال شعر کے معنی میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔

غالب کی تکنیک میں چند اور بھی ایسے مسائل موجود ہیں جو قاری کو چکرا دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔وہ الفاظ بل کہ بسا اوقات فقرے کے فقرے چھوڑ جاتا ہے۔معنی تک رسائی کے لیے فقروں اور خیالات کا ربط باہمی تلاش کرنے کیلئے بڑی ٹامک ٹوئیاں مارنی پڑتی ہیں۔غالب اپنی بلند خیالی کو لفظی در وبست کے ذریعے وہ وسعت بخشتے ہیں کہ ان کی کیفیت کی ہیجانی اور انتہائی حد تک پہنچنا بعید از قیاس کے مصداق ٹھہرتا ہے۔غالب کے خیالات کی یورش کی غیر معمولی رفتار کا ساتھ دینے کیلئے قاری کا ذہن بھی غیر معمولی مستعدی کا حامل ہونا چاہیے۔دراصل غالب کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت ابہام ہے۔غالب کی گوناگوں شخصیت، ان کا پیچیدہ ذہن، ان کی متحرک متخیلہ، ان کی ملمع زبان، ان کا پیچ در پیچ اسلوب اور ان کی پر جوش تخلیقی قوت سوچنے، سمجھنے اور بازیافت ودریافت کے صدہا کوششوں کے باوجود کلیتاً گرفت میں نہیں آسکی۔اس کی سب سے بڑی وجہ وہ غلاف ہے جو غالب نے اپنے شعری سیاق کے گرد لپیٹ رکھا ہے۔وہ اپنی شاعری میں وہ تمام حربے استعمال کرتے ہیں جن سے ابہام کو تشکیل دیا جا سکے۔

بہ قولِ دانیال طریر ''ابہام غالب کے شعری سیاق کا وصف خاص ہے'' جو انہیں پوری شاعری میں سب سے ممیز کرتا ہے۔یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ ابہام کو شعوری طور پر برتنے کی بنیادی وجہ کیا تھی حالاں کہ اسی کے باوصف ان کی قبولیت عام کا تصور ناممکن تھا۔وہ عہد ذہنی واسلوبیاتی دونوں سطحوں پر غالب کا عہد نہیں تھا اور وہ اس بات کا مکمل ادراک رکھتے تھی۔ابہام دراصل مستقبل کا تصور تھا جس پر دھند کی دبیز تہہ چھائی تھی اور جسے کسی حد تک غالب چاک کر چکے تھے۔ان کے عہد میں یہ صلاحیت ناپید تھے لیکن جو لوگ ان کے بعد اسی فضا سے دوچار ہوئے تو کلام غالب میں معنویت کا ایک جہان کھل گیا۔ابہام زیادہ تر شعر کو بدمزہ اور ہر طرح سے خالی کر دینے کی صنعت ہے۔لیکن غالب نے اسے کمال فن کاری سے

برتا ہے یوں اس کے ذریعے معنی کی طرفین کو چہار سمتی عطا کی اور کثرت کی جانب اس کے در وا کرنے کا کامیاب تجربہ کیا:

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل[23]

ابہام کو تشکیل دینے میں بہ طور معاون غالب نے کئی عناصر اور حربے استعمال کیے۔ سب سے بڑا حربہ تو ان کی ترکیب سازی ہے۔ ان کی دو لفظی، سہ لفظی اور چار لفظی ترکیب کی بنت میں اس کمال فنکاری کو ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے جس سے معنی کی تفہیم میں الجھاوا پیدا کر دیا جائے۔ تراکیب کے علاوہ علامات، تمثال اور استعاروں کو جس کمال سے برتا ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے اپنی کتاب ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں غالب کے ان الفاظ کی مختصر فہرست پیش کی ہے جن کے کثیر استعمال سے غالب نے ابہام تخلیق کیا ہے۔

''شوق، جلوہ، وحشت، حیرت، تماشہ، آئینہ، جوہر، طوطی، سبزہ، لالہ، سویرا، سیاہ، داغ، دود، شرر، بجلی، برق، خورشید، شمع، آتش، چراغ، شعلہ، موج، دریا، بحر، حلقہ، دام، تار، زنجیر، نالہ، فغاں، خموشی، خندہ، نوا، آواز، زخم، نگر، چشم، نظر، دیدہ، انتظار، خواب، عدم، دشت، صحرا، بیاباں، خاک، ذرہ، غبار، تصویر، جادہ، نقش، تپش، طاؤس، نقش، نیرنگ، طلسم[24].

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ الفاظ کہیں بہ طور علامت، کہیں بہ طور تمثال اور کہیں بہ طور استعارے کے برتے گئے ان سے جڑے تلازمات کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے اور الفاظ کی اس فہرست کو بھی کسی طور مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اس کاری گری کی مزید وضاحت کے سلسلے میں یہاں استعارے کی صنعت پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ استعارے کو شاعری کی جان بتایا جاتا ہے۔ متخیلہ مختلف تصورات کو باہم جوڑنے کیلئے استعارات تلاشتی و تراشتی ہے۔ دوسرے مڈلٹن مرے کے بہ قول 'ایجاز و اختصار برتنا چاہو تو استعارے سے نہیں بچ سکتے'۔ استعارہ، نفس مضمون کے علاوہ شاعر کے ذہن، نفسیات اور نظر کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے پسندیدہ استعاروں سے اس کی قوت مشاہدہ اور پسند ناپسند، گہرائی و گیرائی کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شان الحق حقی کے بہ قول: غالب نے کوئی لفظ استعارے کے طور پر اتنی فراوانی سے نہیں برتا جتنا کہ

لفظ ''آئینہ'' چناں چہ لکھتے ہیں:

''لفظ 'آئینہ' کی بھرمار ان کے ابتدائی کلام میں بعد کے کلام سے زیادہ ہے۔۔۔ عمر کے ساتھ رفتہ رفتہ اعتدال پر آتا گیا۔اردو کے متداول دیوان میں لفظ 'آئینہ' ۴۴ بار آیا ہے اور پورے اردو کلام میں ۲۶۵ بار۔فارسی دیوان بھی اس کی تکرار سے خالی نہیں،اس میں بھی ۱۸۸ آئینے ملتے ہیں(نسخہ نول کشور)ان میں ہر آئینہ اور آئینے کے مترادفات، مرآۃ وغیرہ شامل نہیں۔۔آئینے کے تلازمے کے طور پر عکس، تمثال، تصویر، نقش، صورت، شکل، شبیہ، پرتو، صیقل، طوطی، زنگار،اسکندر، حلب وغیرہ کا وارد ہونا تعجب کی بات نہیں، ان کا سلسلہ بھی خاصا دراز ہے۔صرف اردو کلام میں عکس کی ۲۰ اور تمثال کی ۲۵ مثالیں میرے سامنے ہیں۔لفظ 'آئینہ' کو غالب نے مجرد بھی باندھا ہے اور تراکیب میں بھی برتا ہے[25].

آئینہ کا استعارہ غالب کی شخصیت میں موجود حیرت ہی کا استعارہ نہیں بل کہ یہ غالب کے ان چند مرغوب الفاظ میں سے ایک ہے جس کی بہ دولت وہ اپنے کلام میں بہ یک وقت ابہام پیدا کرتے ہیں اور معنی کی تکثیریت پیدا کرتے ہیں۔اس طرح قاری کو بھی اسی حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ خود دوچار ہوئے۔آئینہ کے سامنے آئینہ یا منظر کے سامنے آئینہ رکھنے سے عکس در عکس، شبیہ در شبیہ اور معنی در معنی کا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔یہی غالب کے شعری سیاق کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا[26]

غالب کے ہاں ابہام کے تشکیلی عناصر میں سے ایک صنعت تعقید کا استعمال عام ہے ۔یعنی لفظوں کی نشست و برخاست میں ایسی بے ترتیبی پیدا کر دینا جس سے شعر کی تفہیم دشوار ہو جائے۔یہ صنعت معنی کو پر پیچ بناتی ہے اور قاری کو ذہنی الجھن میں مبتلا کرتی ہے۔یہ ایک کرتب ہے جو انہوں نے تسلسل سے استعمال کیا ہے۔اس کے ذریعے وہ مراق کی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس سے قاری کا شعور دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ایک سادہ سے شعر کی مثال پیش خدمت ہے جس میں تعقید کو برتا گیا ہے:

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہات انتظار ہے[27]

اس شعر کی شرح شمس الرحمن فاروقی نے یوں کی ہے:

''سارا آئینہ انتظار مجسم بن گیا ہے۔اس حد تک کہ اگر انتظار کو ایک عالم (شش جہت) فرض کریں تو آئینہ اس کا فرش معلوم ہوتا ہے۔یعنی آئینے میں ایک بار جلوہ منعکس ہوا تھا، آئینہ اس قدر خود رفتہ ہوا کہ سراسر حیرت بن گیا یا کسی شخص نے جلوہ ایک بار دیکھا اور اس قدر متحیر ہوا کہ سراپا آئینہ بن گیا۔ پھر جلوہ آئینے سے (یا نظر سے) غائب ہو گیا۔اب آئینے کو ہر دم اسی جلوے کا اس قدر شدت سے انتظار ہے یا حیرت اب بھی اس قدر ہے کہ وہ متحیر شخص سراپا حیرت (یا سراپا آئینہ) ہے۔ گویا وہ شش جہت انتظار کا فرش بن گیا ہے [28].

ابہام کی تشکیل کا ایک اور اہم حربہ قواعد کی تحریف بھی ہے۔ وہ ایک سے زیادہ فقروں اور مجرد حالتوں کے لیے ایک ہی فعل استعمال کرتے ہیں۔ جیسے:

وحشت خواب عدم شور تماشا ہے اسد
جو مژہ جوہر نہیں آئینہ تعبیر کا [29]

اس شعر میں ایک لفظ ''ہے'' دو بالکل مختلف حالتوں کو محیط ہے اور ان میں ایک پل کا کام کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ غالب مادی اور غیر مادی، مجرد اور غیر مجرد اشیاء کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیتے ہیں، یعنی خارجی موجودات کو ذہنی اور جذباتی کوائف میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جس سے ابہام جنم لیتا ہے۔

بس کہ ہوں غالب ! اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا [30]

چناں چہ غالب خیال کے اظہار میں فن شاعری کی تمام معروف صنعتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ مثلاً تشبیہ و مبالغہ، استعارہ و خیال آرائی، تلازمات کی کثرت اور مطابقت، معنی کی خاطر زبان کے عام استعمال سے انحراف۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ ان تمام صنائع کو اس طرز سے بروئے کار لاتے ہیں کہ ان کے اسلوب کی سب سے اہم صفت ابہام برقرار رہے۔

غالب کے اسلوب کی ترکیب میں چھوٹے چھوٹے اور معمولی نوعیت کے کئی اور خصائص یک جا دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے فجائیہ کلمات کثرت سے استعمال کیے ہیں۔افسوس، الہی شکر، آفریں ہے، حیف، خوشا، عبث، کاشکے، خدا کرے، ہائے ہائے، مبارک مبارک، نہ کہیو، نہ پوچھو وغیرہ۔ تشبیہ کے اتنے پیرائے یک جا کسی شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتے۔عام حروف تشبیہ کے علاوہ، ایسا، جوں، یوں، جیسا، جیسے

کہ، مثل، مانند، مانا، گویا وغیرہ کے ساتھ مشبہ ''بہ'' کی بھی کئی نئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں مثلاً آسا، بہ رنگ، بہ شکل، بہ صورت، باانداز، نما، نمط، وار، ساں، بہ ساں، صفت، عکس، آئینہ وغیرہ:

صافی رخ سے ترے ہنگام شب
عکس داغ مہ ہوا عارض پہ خال[31]

تشبیہ کی بے شمار صورتوں کے علاوہ ان کے ہاں اسماء کی بھی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ان میں سے اکثر بہ طور تلمیح استعمال ہوئے ہیں۔آدم، بہرام، خسرو، قیس، جمشید، فرعون، فرہاد، سام عیسیٰ، موسیٰ وغیرہ۔مقامات کا ذکر بھی کثرت سے ہوا چناں چہ مصر و نجف سے لے کر انگلستان تک بے شمار مقامات کو یاد کیا گیا۔غالب کی نکتہ سرائی کی ایک خاص ادا ان کا طنزیہ و ظریفانہ لہجہ بھی ہے۔ان کی ظرافت کا تجربہ بھی سنجیدہ شاعری کے ضمن میں اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے۔بہ قول مجنوں گورکھپوری:

''غالب افکار اور الفاظ کے درمیان مکمل آہنگ کے قائل تھے۔ان کے اسلوب میں بہ یک وقت منطقی ترتیب اور جمالیاتی تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔الفاظ ہوں یا تشبیہات و استعارات یا دوسری صنعتیں وہ ان کو بڑی حکیمانہ فرزانگی اور حسن کارانہ شعور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں[32].

الغرض غالب کے ذہن میں مختلف النوع مظاہر اور منتشر تصورات کو منظم کرنے کی بڑی خاص صلاحیت پوشیدہ ہے۔وہ بہت سے جداگانہ خصائص رکھنے والے عناصر کو ایک اکائی میں بدلنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔ان کے اشعار کو ہم ''قوس قزح'' سے تعبیر کر سکتے ہیں جس میں کئی رنگ مل کر ایک شبیہ بن جاتے ہیں لیکن اس شبیہ کے خط و خال کو واضح کرنا قاری کی ذاتی استعداد پر منحصر ہے۔اس مبہم صورت حال اور اس لاینحل مشکلات کے باوجود غالب کے کلام میں کوئی ایسی کشش موجود ہے جو ہمیں بار بار اس کی قرأت پر مجبور رکھتی ہے۔عسیر الفہمی نے ہی ان کے کلام کو پرکشش بنا رکھا ہے۔معنی کی تلاش اور اس عسیر الفہمی کی گرہ کشائی کے شوقین قارئین کی کمی نہیں اس لیے غالب کا طلسم تاحال کارگر ہے۔لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں غالب کا کلام کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں رکھتا وہاں بھی اس میں عجیب داستانوی اور دیومالائی پراسراریت موجود ہے۔

حوالہ جات

[1] اسد اللہ خاں غالب ''دیوان غالب کامل''، مرتبہ، کالی داس گپتا رضا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت سوم۱۹۹۶ء۔۹۷ء، ص۲۸۶

[2] ایضاً، ص۳۱۱

[3] ایضاً، ص۲۸۷

[4] ایضاً، ص۲۸۰

[5] ایضاً، ص۱۵۷

[6] یوسف حسین، ڈاکٹر ''اردو غزل''، مکتبہ جامعہ لاہور، سن ندارد، ص۲۶۹

[7] اسد اللہ خاں غالب، ص۲۷۷

[8] ایضاً، ص۲۲۹

[9] ایضاً، ص۳۱۲

[10] ایضاً، ص۲۵۰

[11] خلیل صدیقی، ''غالب کا اسلوب''، مشمولہ، غالب شناسی اور نیاز و نگار، مرتبہ، ڈاکٹر سلیم اختر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ۳۴۶

[12] اسد اللہ خاں غالب، ص۳۰۲

[13] ایضاً، ص۲۷۷

[14] ایضاً، ص۲۳۸

[15] ایضاً، ص۲۵۸

[16] ایضاً، ص۲۸۷

[17] ایضاً، ص۲۷۷

[18] سلیم اختر، ڈاکٹر، مرتبہ، ''غالب شناسی نیاز و نگار''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۴۷

[19] افتخار جالب، ''غالب۔ ہیئت شناس و ہیئت ساز''، مشمولہ، صحیفہ (غالب نمبر)، حصہ دوم، لاہور، اپریل۱۹۶۹ء، ص۳۷

[20] اسد اللہ خاں غالب، ص۱۲۴

[21] احمد علی، پروفیسر، ''غالب کے کلام میں طرز و اسلوب کا مسئلہ''، مشمولہ، جہات غالب، مرتبہ، ممتاز حسن، ادارۂ یادگار، غالب، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۱۹، ۲۲

[22] دانیال طریر، ''جدیدیت، مابعد جدیدیت اور غالب''، مہردر انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۲۰۱۳ء، ص۳۹، ۴۰

[23] اسداللہ خاں غالب، ص ۲۹۰

[24] شمس الرحمن فاروقی، ''شعر، غیر شعر اور نثر''، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، دوسری اشاعت ۱۹۷۳ء، ص ۲۸۰

[25] شان الحق حقی، ''آئینہ افکار غالب''، ادارئہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۶۱

[26] اسداللہ خاں غالب، ص ۲۲۷

[27] ایضاً، ص ۱۸۹

[28] شمس الرحمن فاروقی، ''تفہیم غالب''، اظہار سنز، لاہور، سن ندارد، ص ۳۸۴،۳۸۵

[29] اسداللہ خاں غالب، ص ۱۱۲

[30] ایضاً، ص ۱۱۲

[31] ایضاً، ص ۱۴۸

[32] مجنوں گورکھپوری، ''غالب۔ شخص اور شاعر''، مکتبہ ارباب قلم، کراچی، ۱۹۷۴ء، ص ۶۹